جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب (کراچی)

محدث و شیخ حضرۃ مولانا
سید فضل اللہ الجیلانیؒ

کچھ یادیں اور کچھ یادداشتیں

حضرت مولانا سید فضل اللہؒ امام طریقت غوث الاعظم قدس سرہ کی اولاد میں بائیں پشت پر آتے ہیں۔ والد ماجد کا انتقال جوانی میں ہو گیا تھا۔ مولانا کی عمر اس وقت ۷ برس تھی۔ اس لئے ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت اپنے جدِ بزرگوار حضرت مولانا سید محمد علی کانپوری ثم مونگیری سے راست پائی اور سندِ فراغت اور خلافت باطنی بھی انہی سے حاصل کی۔ اس تکمیل کے بعد مولانا حیدرآباد دکن تشریف لائے۔ اس وقت مولانا کے خسر مفتی عبد اللطیف علی گڑھیؒ یہاں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں استاذ تھے۔ مولانا انہی کے ساتھ محلہ عثمان شاہی میں رہے۔ حیدرآباد آکر مدرسۂ نظامیہ سے "کامل" کی سند ایک ہی میں حاصل کر لی حالانکہ اکثر فضلاء دو دو اور تین مرتبہ میں پاس کر سکتے تھے۔ اس کے بعد مولانا جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں استاد مقرر ہو گئے۔ اور پھر درجہ بدرجہ ترقی کر کے صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مولانا سے میرے والد ماجدؒ کے تعلقات میں اپنے لڑکپن سے دیکھتا رہا۔ دونوں قریب قریب ہم عمر تھے۔ مگر مولانا والد صاحب کو "بھائی صاحب" سے مخاطب فرماتے اور والد صاحب ان کی علمی فضیلت اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے "مولانا" کے لفظ سے خطاب کرتے اور ادب سے پیش آتے تھے۔ ادھر میرے خسر مرحوم (مولانا محمد علی) سے مولانا کے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ دونوں عالم و فاضل اور ایک ہی شعبہ میں استاذ فقہ و حدیث تھے۔ مگر میرے خسر مولانا کو فنِ حدیث میں معلم العلماء کا درجہ دیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ وہ طلبہ کے کام کے کم اور علماء کے مطلب کے زیادہ ہیں۔

حضرات گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ و مولانا عبد الباریؒ سے وہ عمر میں تقریباً دس برس چھوٹے تھے۔ مگر کثرتِ صوم، تکثیرِ نوافل اور ترکِ لایعنی مولانا کے مزاج کا خمیر تھا، اس لئے یہ دونوں اکابر ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

راقم ناچیز کی محبت و عقیدت کا مرکز چونکہ حضرت گیلانی کی ذات گرامی تھی اس لئے جب تک حیدرآباد رہا

اور حیدر آباد میں ہم رہے نظر کو کسی اور سمت دیکھنے کی ضرورت کا احساس تک نہ تھا، بلکہ سقوط حیدر آباد کے بعد بھی جب کراچی آنا ہوا تو مراسلتی تعلق بھی بس حضرت گیلانی ہی سے رہا۔ ۱۹۶۵ء میں خوش بختی سے حج کی سعادت میسر آئی تو مدینہ منورہ میں میرے ایک محترم دوست نے بتایا کہ حضرت مولانا فضل اللہ صاحب ایک عرصہ تک حرمین شریفین میں رہ کر اپنے بڑے داماد سے ملنے ریاض گئے۔ وہاں مسجد کے قصد سے سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار موٹر کی ٹکر سے مولانا کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، کچھ علاج ریاض کے ہسپتال میں ہوا اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے اب انہیں پاکستان کراچی شہر میں پہنچا دیا گیا ہے، جہاں اُن کی بڑی صاحبزادی اور بچے رہتے ہیں۔ واپسی حج پر یہ خیال برابر رہا کہ کسی طرح مولانا کی خبر گیری کر سکوں، مگر پتہ نہ مل سکا۔ اور اس پر چند ماہ گذر گئے۔ یہاں تک کہ مولانا چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔

ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک طالب علم کے ساتھ غریب خانہ پر پہنچ گئے، معلوم ہوا کہ مخدومی حضرت مولانا بنوریؒ کے ہاں تشریف لے گئے تھے، ان سے میری بابت پوچھا تو جیسی ان کی نوازشیں اس ناچیز پر تھیں مولاناؒ نے فرمایا کہ "میں خود ساتھ چل کر آپ کو ان کے گھر پہنچاتا مگر اس وقت ضروری مصروفیت ہے۔ اس لئے سواری اور طالب علم کا انتظام کئے دیتا ہوں" ـــــ بہرحال حضرت سے مل کر جو مسرت ہوئی ہوئی۔

اب ربط بڑھتا گیا۔ قریب سے دیکھا تو اپنے رنگ میں منفرد نظر آئے، غرقِ توحید اور ساتھ ہی ساتھ عمل کی جزئیات میں اور ذوق و مشرب کے نکھار میں خالص سنّتِ نبوی کو قبول کئے ہوئے، ظاہر ثقہ مولویانہ اور باطن بالکل بے ہمہ و با خدا بات کرتے تو عام طور پر روزمرّہ زندگی کی یا پھر خالص علمی و درسی، صوفیانہ قیل و قال ان کی مجلس میں بالکل نہ ہوتا تھا۔ یوں بھی وہ زیادہ مجلسی نہ تھے، بلکہ خلوت پسند۔ ان کا زیادہ وقت دیکھا کہ اپنی تالیف انیف فضل اللہ الصمد فی شرح الادب المفرد کی طباعتی اغلاط کی تصحیح اور اسکی نظر ثانی یا پھر اپنے خسر مولانا عبد اللطیف علی گڑھ کی (غیر مطبوعہ) شرح ترمذی کی ترتیب و تدوین میں گذرتا تھا۔ میرے غریب خانہ پر اکثر تشریف لاتے، اور گھنٹہ دو گھنٹہ ٹھہرتے، کچھ وقت والد صاحب قبلہ کے لئے رہتا اور بڑا حصّہ اس عاجز کے لئے۔ اس تنہائی میں البتہ طریقت و حقیقت کی کوئی بات پوچھی جاتی تو اسکا جواب نہایت تشفی بخش عطا فرماتے۔ اور کبھی کبھار اپنی طرف سے بھی رمز کشائی نہایت سیدھے سادھے لفظوں میں فرما دیتے تھے۔

اس سب کے باوجود یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی نہ آتی کہ مولانا سے باضابطہ اُن کے سلاسلِ نقشبندیہ و قادریہ میں اکتساب فیض کروں۔ مگر اس رزاقِ مطلق کی شان کے قربان وہ بے سان و گمان سمت سے عطا کرتا ہے۔ (ویرزقہ من حیث لا یحتسب) اور اپنی اس تقسیم میں وہ خود مختار ہے ـــــ یہاں اعتراض کیا معنی استعجاب بھی نری نادانی ہی ہے ـــــ ہوا یہ کہ اتوار (۷ر صفر ۱۳۹۱ھ) کو جو ان دنوں چھٹی کا دن

تھا۔ میں مولانا کو ان کے حسب ایماء اپنے گھر لایا۔ کچھ دیر لیٹے رہے، پھر اُٹھے، وضو کیا، تحیۃ الوضو پڑھ کر تلاوت کلام اللہ میں مشغول ہوگئے۔ میں اپنے کام میں لگ گیا، تلاوت سے فارغ ہو کر مجھے یاد فرمایا۔ حاضر ہُوا تو فرمانے لگے کہ وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھ لیجئے، جب تعمیل کر چکا تو میرا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر فرمایا کہ "میں نے آپ کو نقشبندیہ سلسلہ میں داخل کر کے اسکی اجازت دی، اب آپ کا خود نفع اسی میں ہے کہ آپ دوسروں کی اصلاح میں لگ جائیں، میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں اس لئے میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کو یہ کام سپرد کر دوں۔"

اس بے طلب عنایت کے بعد چار چھ دن کا وقفہ دے کر جب مولانا کی قیام گاہ پر حاضر ہُوا تو ایک عبا اور صدری حضرت نے عنایت فرمائی کہ یہ ہمارے بزرگوں کا دستور رہا ہے۔ پھر جب نومبر ۱۹۷۲ء میں ہندوستان روانہ ہونے لگے۔ اور آہ کہ پھر ملنا نصیب نہ ہُوا ـــــ تو یہ تحریری سند بھی عطا فرمائی:

باسمہ تعالیٰ شانہ

الحمد للہ الذی جعل الدین خدمتہ وجعلھم ورثۃ الانبیاء والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و مصطفی الانبیاء سیدنا ومولانا محمد صاحب الشریعۃ الغرآء۔

اما بعد ـــــ فان اخی فی الدین الحاج الفاضل غلام محمد بن الشیخ غلام نبی سلمہ اللہ تعالیٰ قد اخذ حظاً وافراً من علوم الدین وصحب خیرۃ العلماء الذین کانوا لھم اسوۃ صالحۃ بررالقیاء ولما وجدتہ اھلاً للنصیحۃ وتربیت الصالحین فاجزتہ لہٗ لکل ما اخذت من جدی مولانا السید محمد علی رحمہ اللہ. مؤسس ندوۃ العلماء ـــــ بارک اللہ لہٗ خدمۃ الدین وتقبل اللہ منی ومنہ مجھودنا المبذول فی نشر الاسلام وایصالہ الی المسلمین وبقی اثارہ الی یوم الدین۔

واوصیہ بالتقویٰ فی السر والعلن وان یتحمل الاذی فی تربیۃ السالکین ویکون منبسطاً فی وجوہ الطالبین واللہ یعینہ فی کل ان وحین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

انا العبد الجانی فضل اللہ غفرلہ اللہ
۱۱ر شوال المکرم ۱۳۹۲ھ (۱۸ر نومبر ۱۹۷۲ء)

اس عطائے سند کے ساتھ دعائیں بھی دیں اور بشارتیں بھی سنائیں۔ والحمد للہ علی ذلک۔

بارالہا! استحقاق کچھ نہیں مگر اپنے مقبولوں کے طفیل معاملہ اُن کے حسن ظن ہی کے مطابق فرمانا۔

حضرت مولانا ۱۲ر نومبر ۱۹۷۲ء کو کراچی سے بمبئی روانہ ہوگئے اور وہاں سے علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں حضرت کی دو صاحبزادیاں مقیم تھیں۔ دراصل حضرت کی اولاد نرینہ کوئی نہ تھی، اہلیہ محترمہ کا انتقال بھی جلد ہی ہوگیا تھا، اس لئے وہ اپنی صاحبزادیوں کو پدرانہ اور مادرانہ شفقت سے دیکھتے رہے۔ علی گڑھ پہنچ کر مولانا کی صحت گرتی ہی گئی، جب تک طاقت نے بالکل جواب ہی دے نہ دیا۔ حضرت مولانا دو آدمیوں کے سہارے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر برابر مسجد پہنچتے رہے، جماعت اور مسجد سے انہیں غیر معمولی محبت تھی، فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں تو بس نماز ہی میں سب سے زیادہ لذت ملتی ہے۔ مگر بالآخر اس نورانی شمع کی لو دھیمی ہوتی ہوگئی۔ اور ۲۳ر مئی ۱۹۷۹ء کو یہ چراغ بجھ گیا۔ انا للہ۔ ورحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا کا آبائی وطن سہارنپور تھا جب مولانا کے جد بزرگوار حضرت مولانا محمد علی اپنے شیخ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہ کے ارشاد پر مونگیر (بہار) منتقل ہوگئے تو مولانا بھی مونگیری تھے۔ مگر عمر کا اصل حصہ (تقریباً پچاس برس) حیدرآباد (دکن) میں گذرا۔ اس لئے وہ حیدرآبادی بن گئے تھے، مگر موت کا مقام علی گڑھ مقدر تھا۔ حضرت نے اپنے آخری والانامہ میں اس عاجز کو لکھا تھا کہ یہاں میں بھی وطن سے دور ہوں اور آپ بھی مہاجر ہیں، کیا عجب کہ حق تعالیٰ ہم دونوں کو مہاجرت کی موت کا اجر عطا فرمائے۔

اب حضرت مولاناؒ کے چند ملفوظات جو یادداشتوں کی صورت میں محفوظ کر لئے گئے تھے، ناظر کے ذوقِ علم وعرفان کی ضیافت کے طور پر پیش ہیں۔

۱۔ علم تو غلامی چاہتا ہے، جو اس سے بے نیازی برتتے تو وہ بھی اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۲۔ بقاء اہل دل علماء ہی کی خدمات کو حاصل ہوتی ہے۔ ائمہ فقہ صرف چار ہی نہیں ہوئے بلکہ کئی ہوئے ہیں۔ اور علمی اعتبار سے جلیل القدر بھی، مگر سوائے چار کے کسی کو دوامِ قبول نہیں ملا۔ امام اوزاعی کی فقہ مشکل سے ڈیڑھ صدی چل سکی، اسی طرح اور ائمہ کا حال رہا ـــــ اور ان چار ائمہ میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا درجہ باطنی اعتبار سے بہت بلند ہے۔ امام صاحب مسائل پر مذاکرہ فرماتے اور ساری مخالف موافق بحثیں سماعت فرماتے لیکن فیصلہ فوراً صادر نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ پھر تخلیہ میں دل کی روشنی میں ان پر نظر ڈالتے تب کہیں کسی جانب رائے قائم فرماتے تھے۔

۳۔ حدیث کی عظمت بہر طور ملحوظ رہنی چاہئے۔ یہ بڑے غضب کی بات ہے کہ جہاں صاف وصریح قوی حدیث موجود ہو تو اس سے صرف نظر کرکے محض حنفی مسلک کو ثابت کرنے کے لئے مرسلات اور کمتر

درجہ کی حدیثوں سے استدلال کیا جاتا ہے۔

۴۔ فقہاء میں اختلاف رائے ہے کہ جمعہ کے غسل کا جو وضو ہے، وہ غسل ہی کا ہے۔ یا نماز جمعہ کا۔ ہمارے دادا (حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ) دونوں قول کو عملاً یوں جمع فرماتے تھے کہ جمعہ کا غسل تاخیر سے فرماتے اور اسی وضو سے مسجد تشریف لے جاتے۔

۵۔ دادا رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی بسم اللہ پڑھانے کو کہتا تو وہ بسم اللہ اور اقراء کی ابتدائی آیتیں نہیں پڑھاتے تھے بلکہ حدیث شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جسطرح منقول ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت پڑھاتے:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۝

۶۔ میں نے الادب المفرد کو اس لئے منتخب کیا کہ اس میں سب ابواب اخلاق و اصلاح معاشرت کے ہیں اور آج اسی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ پھر چونکہ اس میں عقائد کی بحثیں نہیں ہیں۔ اس لئے بلا امتیاز عقیدہ سب اسکی طرف متوجہ ہوں گے اور حدیث شریف کی برکت سے اتباع سنت کا ذوق بھی پیدا ہو جائیگا۔ اور بدعات چھوٹ جائیں گی۔

۷۔ قرآن پاک کے درس و تدریس سے باطنی نفع بہت ہوتا ہے اور قلب میں جلاء پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ داداؒ کے ہاں پہلے حلقۂ توجہ کا اہتمام تھا، مگر آخر بیس پچیس برس میں ترک فرما دیا تھا۔ سب زوائد ترک کر دیئے اور بس سنت ہی کے اعمال پہ زور دیتے تھے، اور ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ جس چیز کو بزرگوں نے ایک ذریعہ اور معالجہ سمجھ کر برتا تھا۔ اسکو مقصد سمجھا جانے لگا تھا۔

۹۔ داداؒ کی مجلس بھی عجیب مجلس ہوتی تھی، بعض علماء حضرات بالکل خاموش بیٹھے رہتے اور چلے جاتے۔ انہی سے میں نے سنا کہ ہم نے یہ پوچھا تو حضرت نے اس کا یہ جواب دیا، وہ وہ سوال و جواب ہوتا تھا جسکو ہم نے حاضر باشی کے باوجود کے باوجود مجلس میں نہیں سنا۔

۱۰۔ حضرت شاہ فضل رحمنؒ فرماتے تھے، اب لطائف کی تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں، صرف لطیفۂ قلب کو مرکز توجہ رکھا جائے کیونکہ تمام لطائف اسی میں مندرج ہیں۔

۱۱۔ نہ معلوم لوگوں کا اس میں کیا خرچ ہوتا ہے اور کیوں اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ ہاتھ کام میں رہے اور دل یادِ الٰہی میں رہے۔

۱۲۔ اصل چیز ایمان پہ خاتمہ ہے، اسکی بھی کیا فکر کہاں موت آئے۔

۱۳۔ ہمارے داداؒ کے پہلے شیخ قادریہ سلسلہ کے تھے، حضرت شاہ کرامت علیؒ وہ افغانی تھے۔ داداؒ کی عمر ۱۵، ۱۶ برس کی ہوگی کہ شاہ صاحب نے تین چار دن مسلسل داداؒ کے پیچھے نمازِ فجر پڑھی، اجنبی پاکر داداؒ نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ کون ہیں؟ شاہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟" داداصاحبؒ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ پھر شاہ صاحب نے فرمایا: "تیرے رب نے مجھ کو تیری ہدایت کے لئے یہاں بھیجا ہے۔" داداؒ پر گریہ طاری ہوا۔ اور بیعت کی درخواست پیش کردی، شاہ صاحب نے فرمایا اس وقت نہیں، پھر دوسرے دن بیعت فرمالیا۔ دس مہینے بعد شاہ صاحب نے قادریہ سلسلہ میں خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اور اس کے چند روز بعد وصال فرماگئے ـــــ اس کے بعد دادا صاحب نے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے اخذ بیعت کی اور خلافت پائی۔

۱۴۔ ہمارے داداؒ کا نام سن کر جن بھاگ جایا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ جن بات کیسے مان لیتے ہیں۔؟ تو فرمایا کہ یہ درود شریف پڑھو تو جن بات کا انکار نہ کرے گا۔

اللھم صل وسلم علی سیدنا محمد وعلی ال محمد وعلی مومن الجنّ۔

۱۵۔ راقم الحروف نے حضرت مولانا فضل اللہؒ سے عرض کیا کہ حضرت مجھے کراچی کے فلاں بزرگ سے محبت تو ہے مگر عقیدت و مناسبت بالکل نہیں، اس لئے میں وہاں نہیں بیٹھتا۔ فرمایا جس نے علماء کی صحبت پائی ہو اس کا دل غیر عالم کے پاس لگ ہی نہیں سکتا۔ اور آپ نے اپنے وقت کے بے مثال جامع عالم کی صحبت حاصل کی ہے۔ حضرت سیّد صاحب بحرالعلوم تھے۔ سمندر کے پاس بیٹھنے والے کا دل دوسری جگہ کیسے لگ سکتا ہے۔ حضرت سیّد صاحب تو ایک بحرِ ناپیدا کنار تھے۔ کسی علم میں بھی ان سے بات کی جائے کچھ حاصل ہو ہی جاتا تھا۔

۱۶۔ میرا لڑکپن تھا اور حضرت سید صاحبؒ (مولانا سید سلیمان ندویؒ) جوان تھے، اس وقت بڑے پتہ کی بات مجھ سے فرمائی تھی کہ: "امام ابوحنیفہؒ کی عظمت مسلم مگر انوارِ نبوت کو حنفیت میں مقید تو نہیں کیا جا سکتا۔" ـــــ مجھے اس وقت تو اس ارشاد کی قدر نہ ہوئی مگر جب حدیث سے شغف بڑھا تب اس قول کی قدر و منزلت سمجھ میں آئی۔

۱۷۔ مولانا عبدالباری ندویؒ کا رنگ پہلے کچھ اور تھا۔ مگر جب حضرت تھانویؒ سے رجوع کیا تو اس رنگ میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ مولانا کی تصانیف انشاءاللہ قیامت تک باقی رہیں گی۔

۱۸۔ ـــــ صاحب نے مجھ سے وحدت الوجود کے مسئلہ کی تفہیم چاہی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ قیل و قال سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اگر آپ ایک ہفتہ میرے لئے فارغ کرلیں تو انشاءاللہ میں اسکو حالاً سمجھا دوں گا ـــ مگر

افسوس انہوں نے وقت نہ نکالا۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید وہ واقعتہً سمجھانا چاہتے ہیں۔

۱۹۔ مراقبہ آسان کام نہیں۔ اس کے لئے قوی انسان چاہئے۔ صحیح مراقبہ کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ جسم مشکل سے برداشت کر سکتا ہے۔

۲۰۔ آجکل کے دور میں ایمان اور کچھ اعمال صالحہ کی توفیق مل جانا ہی بہت بڑی بات ہے۔

۲۱۔ اس دور کے مصائب و آلام میں میں نے اس مراقبہ کو بے حد مفید پایا کہ :

"اللہ تعالیٰ مجھ کو پیار کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔"

اس سے قلب کو بڑی سکینت اور انشراح میسر آتا ہے۔

۲۲۔ حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ[1] (چشتی۔ حیدر آبادی) کی صحبت سے مجھ کو توحید میں بڑا نفع حاصل ہوا، حضرت نے مجھے خلافت بھی اپنے سلسلہ میں عطا فرمائی اور وصیت فرمائی کہ ان کی نماز جنازہ میں پڑھاؤں چنانچہ میں نے ہی حضرت کی نماز جنازہ پڑھائی۔

یہ ملفوظات اپنے ذخیرۂ محفوظ کا تقریباً آدھا حصہ ہے۔ بقیہ حصہ مجلس خاص میں تو پیش ہو سکتا ہے۔ مگر وقف عام نہیں کیا جا سکتا۔ ■■

---

[1] جن کے خلفاء میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اور حضرت ڈاکٹر میر ولی الدین رحمہما اللہ سے علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ متعارف ہے۔

خوشخبری

دعوات حق کی دوسری جلد

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کے خطبات و مواعظ اور ارشادات کا عظیم الشان مجموعہ علم و حکمت کا گنجینہ جسکی پہلی جلد کو ہر طبقے میں سراہا گیا۔ اور اہل علم و خطباء اور تعلیم یافتہ طبقہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور جس کا کوئی ایک نسخہ بھی اس وقت دستیاب نہیں ــــ الحمد للہ کہ انتظار شدید کے بعد اسکی دوسری جلد کتابت و طباعت کے مراحل سے گذر کر شائع ہوگئی ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پہ مشتمل اس دوسری جلد میں بھی دین و شریعت۔ اخلاق و معاشرت۔ علم و عمل۔ نبوت و رسالت۔ شریعت و طریقت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر حضرت مدظلہ نے عام فہم اور درد و سوز میں ڈوبے ہوئے انداز میں گفتگو نہ کی ہو۔ آج ہی کتاب طلب کیجئے ورنہ جلد اوّل کی طرح اسکی نایابی پر بھی افسوس کرنا پڑے گا۔ صفحات ۵۲۰۔ قیمت چالیس روپے۔ طباعت آفسٹ۔ جلد دیدہ زیب۔

مؤتمر المصنفین ــ دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک۔ (پشاور)